شارب ردولوی

احتجاج کی منفرد آواز : جوش ملیح آبادی

احتجاج ابتدا سے ادب کا حصہ رہا ہے وہ خواہ 'شکوہ اللہ سے خاکم بہ دہن ہے مجھ کو' کی شکل میں ہو یا آلام روزگار کی شکایت۔ ایسا کوئی عہد تلاش کرنا مشکل ہوگا جس کے ادب میں کسی نہ کسی شکل میں احتجاج موجود نہ ہو۔ ہوسکتا ہے کہ کسی کے یہاں اس کا آہنگ بلند نہ ہو اور وہ صرف بین السطور میں ہو، ہوسکتا ہے اس کی نوعیت اشارے، کنائے اور علامت کی ہو یا وہ واضح احتجاج کی شکل میں ہو۔ احتجاج اور اس کی نوعیت کا بیان ایک طویل موضوع ہے لیکن ایک بات ضرور ہے کہ احتجاج ادب کے زندگی، سماج اور تہذیب سے تعلق کی بہت مضبوط سند ہے۔ جب بھی شخصی یا انفرادی زندگی اپنے سماجی حالات سے غیر مطمئن ہوئی یا اجتماعی زندگی فطری آلام یا سیاسی، تاریخی اور معاشی بحران کا شکار ہوئی تو وہ بے اطمینانی یا بحران ادب کے صفحے پر ایک نشانِ سنگ کی طرح ابھر آیا۔ بارہویں صدی ہجری کا دکن ہو یا اٹھارویں صدی عیسوی کا شمالی ہند، اردو شعر و ادب اپنے ابتدائی مراحل میں بھی جس وقت نثر و نظم کے اصول متعین تھے، نہ اظہار و بیان کی کوئی بوطیقا لیکن احتجاج کی لے اس وقت بھی بہت واضح طور پر سنائی دیتی ہے۔ محمود بحری نے

اپنی مثنوی ''من لگن'' میں باقاعدہ ''درشکایتِ روزگار'' کا ایک عنوان قائم کیا۔ جس میں سماجی بُرائیوں سے پیدا ہونے والے انحطاط کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ اس میں احتجاج کا پہلو نمایاں ہے۔ جعفر زٹلی کو تو احتجاج کی قیمت اپنی جان سے چکانی پڑی۔ میرے علم میں وہ پہلے اردو شاعر ہیں جن کی احتجاج میں جان گئی۔ ان کے شہر آشوب ان کے سماجی شعور، سیاسی بصیرت اور حق گوئی کی مثال ہیں۔ میں نے یہ دو اشارے خاص طور پر اس لیے کئے ہیں کہ اُنھیں پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی بہت کچھ ویسا ہی ہے۔

شاعر عام انسان کے مقابلے میں زیادہ حساس اور زود رنج ہوتا ہے اس لیے معمولی سی بات بھی اس کے احساس پر گراں گزرتی ہے اور کہیں نہ کہیں اس کی شاعری میں وہ 'تلخ نوائی' بن کر جھلکنے لگتی ہے۔ اس معاملے میں جوش ملیح آبادی کچھ زیادہ ہی حساس واقع ہوئے تھے۔ کسی کو تکلیف میں دیکھ کر بے چین ہوجانا یا ذرا سی ناگواری پر برس پڑنا ان کے مزاج کا حصہ تھا۔ وہ ایک وسیع انسانی نقطۂ نظر کے حامی تھے۔ دکھ اور تکلیف کسی کی ہو، وہ اُسے اپنے دکھ کی طرح محسوس کرتے تھے۔ ان کے نظریات کتنے ہی تصوراتی یا رومانی کیوں نہ ہوں، ان کی بنیاد انسانیت پر تھی۔ اسی لیے وہ دنیا کو ایک خاندان کی شکل میں دیکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے اپنے اس نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

> میں تمام نوعِ انسانی کو ایک خاندان سمجھتا ہوں۔ وطنیت کے اُس ناپاک تخیل کو جو خود غرضی، تنگ نظری، منافرت اور دین آدم کی تقسیم چاہتا ہے، انتہائی حقارت کی نظر سے دیکھتا ہوں لیکن اس قدر وطنیت پر میرا ایمان ہے کہ اپنے گھر کو غاصبوں کی درندگی سے محفوظ رکھا جائے''
>
> (نظم ''وطن'' پر فٹ نوٹ، شعلہ و شبنم ص 37)

غالب نے تو صرف غربت وافلاس کو دیکھ کر کہا تھا کہ ایک سوت کی ڈوری، لوٹا اور شطرنجی لے کر نکل جاؤں جہاں کوئی بھوکا ننگا نظر نہ آئے۔ لیکن جوش کے یہاں سیاسی، مذہبی، اور قومی ہر طرح کی HEGAMONY بالادستی کے خلاف بغاوت ہے۔ وہ وطنیت کے اس تصور کے بھی خلاف ہیں جس کی بنیاد تنگ نظری، خود غرضی اور منافرت پر ہو۔ وہ

غلامی کے شدید مخالف ہیں۔ ان کی نگاہ میں غلامی انسان کے کردار کو مسخ کر دیتی ہے۔ اسی لیے بار بار وہ غلامی کے خلاف بغاوت کا پرچم بلند کرتے ہیں۔ ان کے احتجاج کی یہ لے ترقی پسندی کی دین نہیں بلکہ ان کا سیماب صفت مزاج، ان کے کردار اور شعور کا حصہ ہے۔ اردو میں ترقی پسند رجحانات سے پہلے ان کے یہاں یہ باغیانہ لے نمایاں تھی۔ یہ ضرور ہے کہ ترقی پسند رجحانات نے ان کی شاعری میں ایک نظریاتی سمت متعین کرنے میں مدد دی۔

اردو شاعری میں مومن پہلے شاعر ہیں جنھوں نے انقلاب، کا لفظ استعمال کیا۔

اے حشر جلد کر تہہ وبالا جہان کو
یوں کچھ نہ ہوا میں تو ہے انقلاب میں

لیکن مومن کے یہاں اس کے پیچھے کوئی سیاسی نقطۂ نظر نہیں ہے۔ جوش پہلے شخص ہیں جنھوں نے 'انقلاب' کے لفظ کو سیاسی بغاوت اور ایک نظام کی تبدیلی کے معنوں میں استعمال کیا۔ 1927 کی ان کی ایک نظم ہے، جس کے ایک شعر پر اعتراضات بھی ہوتے رہے ہیں لیکن جو ان کے اندر ایک پکتے ہوئے لاوے کی مثال ہے جس میں 'قدامت' کو انھوں نے اس وقت کے رہنماؤں اور رائج سیاسی وسماجی نظام کے استعارے کے طور پر استعمال کیا ہے ؎

اے قدامت یہ کھلی ہے سامنے راہ فرار
بھاگ وہ آیا نئی تہذیب کا پروردگار

کام ہے میرا تغیر نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب انقلاب

(نعرۂ شباب/ شعلہ وشبنم ص 17)

جوش کی یہ احتجاجی لے 1927 سے بھی پہلے کی نظموں میں نظر آنے لگی تھی مثلاً ان کی بعض نظموں میں اس طرح کے اشعار مل جاتے ہیں ؎

لبِ حیات نے چھیڑا ہے قصۂ خونیں
مری زبان کو اب رخصت کلام کہاں
چلا ہوں سر بکف اس سمت آج خود ہی جوش
اب آرزو کو سر نامہ و پیام کہاں

(ترکِ جمود 1925)

اے خدا ہندوستان پر یہ نحوست تاکجا
آخر اس جنت پہ دوزخ کی حکومت تاکجا

گردنِ حق پر خراش تیغ باطل تا بہ کے
اہلِ دل کے واسطے طوق و سلاسل تا بہ کے

(حسن اور مزدوری 1926)

اس زمانے کی ان کی دوسری نظموں میں بھی غلامی اور ظلم و جور کے خلاف احتجاج ہے۔ وہ ہندوستان کو بیدار کرنا چاہتے ہیں، کبھی ذلت و رسوائی کا احساس دلاکر کبھی ''اے ہند کے ذلیل غلامان روسیاہ'' کہہ کر ان کی حمیت اور عزت نفس پر ضرب کاری لگاتے ہیں اور انھیں انقلاب پر آمادہ کرتے ہیں ۔

اٹھو وہ صبح کا غرفہ کھلا زنجیر شب ٹوٹی وہ دیکھو
پَو پھٹی، غنچے کھلے پہلی کرن پھوٹی
اٹھو، چونکو، بڑھو اور ہاتھ دھو، آنکھوں کو مل ڈالو
ہوائے انقلاب آنے کو ہے ہندوستان والو

(آثار انقلاب 1927/28)

اٹھائے گا کہاں تک جوتیاں سرمایہ داری کی
جو غیرت ہو تو بنیادیں ہلادے شہریاری کی

(زوال جہاں بانی 1928)

جوش پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان کے تصورِ انقلاب میں دہشت انگیزی ہے اور

ان کی بغاوت، رومانی بغاوت ہے۔ اس میں سچائی بھی ہے لیکن اِسے جس طرح پیش کیا جاتا ہے وہ درست نہیں۔ جوش نہ عملی طور پر سیاسی انسان تھے اور نہ سیاسی مفکر اس لیے ان سے سیاسی اقدار کی توقع کرنا غلط ہی نہیں نا انصافی ہے۔ دوسرے بغاوت کسی دلکش و دلآویز تصور کا نام نہیں ہے۔ وہ تو رائج اقدار کی توڑ پھوڑ کا نام ہی ہے اور اس وقت جوش کے سامنے صرف ایک نقطہ نظر تھا کہ کسی طرح بھی سامراجی حکومت کا خاتمہ ہو اور غلامی کی زنجیر ٹوٹے۔ اس کے لیے ہر شخص کو وہ جوش دلانے اور جدوجہد پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اقبال پر بھی اس دہشت انگریزی کا الزام، ان کے ایک شعر کی وجہ سے عائد ہو چکا ہے ؎

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روٹی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

جوش ایک جذباتی انسان ہیں جس بات کو سچ سمجھتے ہیں اس کے اظہار میں کبھی کوئی مصلحت انھیں روک نہیں پائی خواہ اس میں انھیں کتنا ہی نقصان کیوں نہ اٹھانا پڑے۔ ان کے لیے بغاوت، آگ، بجلی، موت اور آندھی کا نام ہے جو ہر چیز کو اڑا لے جاتی ہے ؎

ہاں بغاوت، آگ، بجلی، موت، آندھی میرا نام
میرے گرد و پیش اجل، میرے جلو جلیں قتل عام

ایک چنگاری مری جنت کو کرتی ہے تباہ
مانگتا رہتا ہے میری آگ سے دوزخ پناہ

رعب سلطانی سے یہ چہرہ اتر سکتا نہیں
جو خدائی سے لڑے شاہی سے ڈر سکتا نہیں

(بغاوت 1932)

جوش کی بغاوت کی اس تندی اور انقلاب کی پُرشور آواز کے بارے میں احتشام حسین نے لکھا ہے:

"اس باغیانہ میلان کا ایک سماجی اور سیاسی پس منظر بھی ہے۔ ہندوستانی

سیاست اور سماج میں اصلاح پسندوں کے اٹھائے ہوئے خمیر نے ایک
طویل مدت میں نئی انقلابی قدریں پیدا کردی تھیں، جن کا ظہور پہلی جنگ
عظیم کے بعد ہوا۔ برطانوی استحصال نے ہندوستانی افلاس کو اُس نقطہ پر
پہنچا دیا تھا کہ جس کے آگے صبر وقناعت کی راہ مسدود ہوگئی تھی"

(جوش ملیح آبادی: انسان اور شاعر صفحہ 66)

اس کی روشنی میں جوش کے احتجاج اور بغاوت کو دیکھا جائے تو اعتراض کی گنجائش کم ہوجاتی ہے۔ اس لئے کہ اصلاح پسندوں کی درمیانی راہ سے جوش کی طرح ملک کا ایک طبقہ غیر مطمئن تھا۔ انگریزی حکومت کے ظلم و جور بڑھتے جارہے تھے۔ غریب طبقہ تو اس کا شکار تھا ہی ساتھ میں درمیانی طبقہ، انقلاب کی بڑھتی ہوئی لے کی وجہ سے اُس کی زد میں تھا اور ذرا سے شبہ پر اس کا نام باغیوں کی فہرست میں درج ہوجاتا اور اُسے طرح طرح کی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ خود جوش تلاشی کی منزل سے گزر چکے تھے جس پر ان کی نظم بھی ہے جس کا عنوان ہی تلاشی ہے ؎

جس سے امیدوں میں بجلی، آگ، ارمانوں میں خوں
اے حکومت کیا وہ شے، اِن میز کے خانوں میں ہے

گھر میں درویشوں کے کیا رکھا ہوا ہے بدنہاد
آمرے دل کی تلاشی لے کہ برآئے مراد

جس کے اندر ناگ ہیں اے دشمن ہندوستاں
شیر جس میں ہونکتے ہیں کوندتی ہیں بجلیاں

موت جس میں دیکھتی ہے منہ اس آئینے کو دیکھ
میرے گھر کو دیکھتی کیا ہے میرے سینے کو دیکھ

جوش کے کلام کے لیے احتجاج اور مزاحمت چھوٹے لفظ ہیں، جن سے بے بسی، بے چارگی اور مدافعانہ عمل کا احساس ہوتا ہے جبکہ جوش کے یہاں ایک طوفان بغاوت

ہے آزادی اور وطن کی سربلندی کے لیے۔

ان کی بہت سی نظمیں ہیں جنھیں احتجاجی، سیاسی، یا مزاحمتی نظموں کا نام دیا جاسکتا ہے دراصل ان کی شاعری کا ایک بڑا حصہ اردو کی احتجاجی اور باغیانہ شاعری کا سرمایہ ہے۔ وہ بے دریغ اور بلاخوف اپنی بات کہتے چلے جاتے ہیں۔ ان کی باغیانہ نظموں میں ان کی ایک نظم ''وفاداران ازلی کا پیغام شہنشاہ ہندوستان کے نام'' ہے جس میں ان کا احتجاج طنز کے نشتروں میں تبدیل ہوگیا ہے ؎

اے گدا پیشوں کے سلطاں، جاہلوں کے تاجدار
بے زروں کے شاہ، دریوزہ گروں کے شہر یار

آپ کے ہندوستاں کے تن پہ اک بوٹی نہیں
تن پہ ایک دھجی نہیں ہے، پیٹ کو روٹی نہیں

ہر جبین پر ہے شکن اُس کی کلاہی کی قسم
ہر مکاں اک مقبرہ ہے قصرِ شاہی کی قسم

آپ کے سرپر ہے تاج، اے فاتح روئے زمیں
اور ہم اہلِ وفا کے پاؤں میں جوتی نہیں

کشور ہندوستان میں رات کو ہنگامِ خواب
کروٹیں رہ رہ کے لیتا ہے فضا میں انقلاب

گرم ہے سوزِ بغاوت سے جوانوں کا دماغ
آندھیاں آنے کو ہیں اے بادشاہی کے چراغ

چونکیے جلدی ہوائے تندوگرم آنے کو ہے
ذرّہ ذرّہ آگ میں تبدیل ہوجانے کو ہے

(تلاشی: 1936)

اسی طرح ان کی نظم ''ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب'' ان کی احتجاجی شاعری میں بہت اہمیت رکھتی ہے۔ یہ نظم ایک خاص موقع پر لکھی گئی تھی اور میرے خیال

میں ہندوستانی ادب میں یہ پہلی نظم ہے، جو دوسری جنگ عظیم میں ہندوستان کے شامل ہونے کے فیصلے کے خلاف لکھی گئی۔ پروفیسر احتشام حسین کے بیان کے مطابق اس وقت کے یوپی کے گورنر سر ہارٹ ہیلٹ نے ہندوستان کی جنگ میں شمولیت کے جواز میں جو اپیل کی تھی کہ ہٹلر درندہ اور عدل و انصاف کا دشمن ہے اس کو روکنا ایک انسانی فریضہ ہے۔ انگریز کے DOUBLE STANDERD پر جوش کب خاموش رہ سکتے تھے۔ انھیں اتنا غصہ آیا کہ اسی وقت یہ نظم لکھی۔ جوش کی شاعری کے بارے میں دو رائیں ہوسکتی ہیں لیکن اس بات میں کسی کو شک نہیں ہوسکتا کہ وہ ایک مخلص اور کھرے انسان تھے۔ جو بات ان کی نگاہ میں غلط تھی، وہ غلط تھی۔ غلامی اور سامراجیت کو وہ ایک لعنت سمجھتے تھے۔ ان کے لیے غلاموں کی عبادت تک حرام تھی۔ ان کی یہ نظم نیا ادب میں شائع ہوئی اور وہ شمارہ ضبط کر لیا گیا۔ یہ نظم گو کہ حکومت کے ایک سیاسی فیصلے کا ردعمل تھی لیکن آج بھی اپنے شدت احساس، کرب اور اظہار و بیان کی وجہ سے احتجاجی اور مزاحمتی ادب کا سرمایہ ہے۔ اِس نظم میں انھوں نے حکومت کے دوہرے معیار کا پردہ فاش کیا ہے اور بڑی بے جگری سے اس پر حملے کئے ہیں ؎

کس زباں سے کہہ رہے ہو آج تم سوداگرو
دہر میں انسانیت کے نام کو اونچا کرو

ہاتھ ہے ہٹلر کا رخشِ خود سری کی باگ پر
تیغ کا پانی چھڑک دو جرمنی کی آگ پر

سخت حیراں ہوں کہ محفل میں تمھاری اور یہ ذکر
نوعِ انسانی کے مستقبل کی، اب کرتے ہو فکر

اپنے ظلمِ بے نہایت کا فسانہ یاد ہے
کمپنی کا پھر وہ دَورِ مجرمانہ یاد ہے

تیسرے فاقے میں اک گرتے ہوئے کو تھامنے
کس کا تم لائے تھے سر، شاہ ظفر کے سامنے

سچ کہو کیا حافظے میں ہے وہ ظلم بے پناہ
آج تک رنگون میں اک قبر جس کی ہے گواہ

مجرموں کے واسطے زیبا نہیں یہ شور و شن
کل یزید و شمر تھے اور آج بنتے ہو حسینؑ

سیاسی جماعتوں کی مصلحتیں کچھ اور ہوتی ہیں لیکن جوش ایک شاعر تھے اس لیے انھوں نے نتائج کی پرواہ کیے بغیر اپنے غم و غصے اور ردعمل کا اظہار فوراً کردیا۔ اِس حق گوئی و حق بیانی کی ہمت اُس وقت اردو شاعروں میں صرف جوش میں تھی۔ جوش کا یہ رویہ صرف ان کے سیاسی احتجاج تک محدود نہیں، وہ ہر معاملے میں اسی طرح اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہیں خواہ وہ سیاسی معاملات ہوں، تہذیبی و سماجی مسائل ہوں یا مذہبی رسوم و عقائد۔ انسان تو انسان ہے وہ خدا کو بھی معاف نہیں کرتے۔ اقبال نے تو ''یزداں بہ کمند آور اے ہمت مردانہ'' ہی کہا تھا لیکن جوش اس سے ایک قدم آگے بڑھ جاتے ہیں ؎

کوئی پکار کے جوش آسمان سے کہہ دے
کہ اب زمیں کو تری بندگی نہیں منظور

جوش کا قومیت کا اپنا ایک تصور تھا۔ جس کا ذکر شروع میں آچکا ہے۔ وہ تصور رومانی ہے یا عملی، غلط ہے یا صحیح، یہاں پر یہ مسئلہ نہیں ہے۔ بات دنیا کو خوبصورت، پُرامن، دلکش اور پُرمحبت دیکھنے کی خواہش کی ہے۔ اُن کی نگاہ میں انسان مثلث کے قید خانے میں مقید ہے اور جب تک وہ اس مثلث کے تینوں زاویوں کو نہیں توڑتا وہ محبت، امن و آشتی اور حسن کو نہیں پاسکتا۔ اِس مثلث کے تین زاویے زبان، مذہب اور محدود وطنیت کا تصور ہیں۔ یہی تین اسباب ہیں جو نفرت تعصب، تنگ دلی، فساد اور جنگ کا سبب بنتے ہیں۔ اور وہ بار بار اس کا احساس دلاتے ہیں ؎

کب تک رہیں گے آخر یہ طنطنے، یہ تیور
یہ تیر، یہ کمانیں، یہ نیمچے، یہ نشتر

یہ آدمی، یہ شاہ، آفاق و میر دوراں
نکلے گا کب حصار جغرافیہ سے باہر

جوش کی احتجاجی شاعری میں ان کے مرثیوں کا بھی شمار کیا جاتا ہے حالانکہ مرثیہ ایک ایسی صنف ہے جس میں براہ راست کسی احتجاج کی گنجائش نہیں۔ جہاں عقیدہ اور مذہب درمیان آجائے وہاں زبان کھولنا اَن دیکھے مسائل کو دعوت دینا ہے لیکن جوش نے روایت سے بغاوت کی۔ انھوں نے تقریباً دس مرثیے کہے ہیں۔ ان کی دو نظمیں، ''سوگوارانِ حسین سے خطاب''، اور 'ذاکر سے خطاب' کو ان کے موضوع کی وجہ سے مرثیے کے بجائے مسدس میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ ان میں واقعات کربلا کے بجائے سوگواران حسین اور ذاکر ان کا موضوع ہیں۔ جوش نے شعلہ وشبنم میں ایسی تمام نظموں کو 'باب اسلامیات' کے تحت رکھا ہے جس میں ان کا پہلا مرثیہ ''آوازۂ حق'' بھی ہے اور یہ مسدس بھی۔

'آوازِ حق' 1918 کا لکھا ہوا مرثیہ ہے۔ جس میں جوش نے مرثیے کی کلاسیکی روایت کا پورا اہتمام کیا ہے اور ان تمام عناصر کو برتنے کی کوشش کی ہے جو اُس وقت تک مرثیے کے لیے ضروری سمجھے جاتے تھے لیکن مرثیے کے اختتام پر انھوں نے پانچ بند ایسے شامل کردیے ہیں جس میں انھوں نے اپنی بات کہنے کا گوشہ پیدا کرلیا ہے اور آزادی کا ذکر کرنے کی راہ نکال لی ہے۔ یہ مرثیہ جس زمانے میں لکھا گیا، وہ خلافت اور عدم تعاون کی تحریکوں کے عروج کا زمانہ تھا اور جوش خلافت تحریک کی تائید کرنے والوں میں تھے اس لیے اس میں اس طرح کے اشعار مل جاتے ہیں ۔

اب بھی جنھیں ملتی ہے رہ عشق میں تعزیر
صدشکر کہ خوش ہوکے پہن لیتے ہیں زنجیر

ڈرتے ہی نہیں دیکھ کے جلاد کی صورت
زنداں میں چلے جاتے ہیں سجاد کی صورت

اک کھیل ہے ان کے لیے شاہوں کی جلالت
سینوں میں ہے ایمان، زبانوں پہ صداقت

کوشش ہے کہ آزاد ہوں پابندِ مصیبت
سر جائے تو جائے نہ کرے تاج خلافت

تقدیر سے جب قلب میں ایمان کی بو ہے
پنجاب کے ناکردہ گناہوں کا لہو ہے

(آوازۂ حق)

اسی زمانے میں جوش نے ایک نظم ''متولیان وقف حسین آباد سے خطاب'' لکھی۔ اس نظم کے نیچے کوئی تاریخ درج نہیں ہے لیکن باب اسلامیات کے تحت یہ لکھا ہے کہ یہ 1927 تک کی نظمیں ہیں، اس لیے اس کا زمانہ بھی وہی ہے، جب جوش انگریز کی غلامی اور سامراجی حکومت کے خلاف اعلان جنگ کر رہے تھے۔ متولیان وقت کے خلاف ان کے احتجاج کے دو اسباب تھے۔ ایک تو ان کی نگاہ میں ۸ر اور ۹ر محرم کی قیامت خیز شب میں جشن کا سماں درست نہیں، دوسرے جس بات نے انھیں چراغ پا کر دیا تھا، وہ امام باڑہ میں ہندوستانیوں کے داخلے پر پابندی تھی یا صرف وہ ہندوستانی اکابرین اندر جاسکتے تھے جو مغربی لباس پہنے ہوں۔ جوش اس بات کو کہاں برداشت کر سکتے تھے، انھوں نے حاکم اور حکومت کی پرواہ کئے بغیر اپنے شدید ردعمل کا اظہار ان الفاظ میں کیا ؎

وہ اداس اور تشنہ دو راتیں سر جوئے فرات
جن کے سناٹے کے اندر گم تھی روحِ کائنات

پرفشاں تھے جن کے سناٹے جرس کے واسطے
تم نے اُن راتوں کو چھانٹا ہے ہوس کے واسطے

مشعلوں میں جس جگہ خونِ شہیداں کا ہو رنگ
سیر کرنے کو بلائے جائیں واں اہلِ فرنگ

یہ تملّق، یہ خوشامد، یہ زبوں اندیشیاں
غم کدہ مسلم کا ہو نصرانیوں کا بوستاں

دعوتِ حرف و حکایت، زلزلے کی رات میں
منعقد ہو جشن اشکوں کی بھری برسات میں

دیدِ عشرت اٹھے صد پارہ لاشہ دیکھنے
ہنسنے والے آئیں رونے کا تماشہ دیکھنے

روحِ مومن کو عطا بارِ خدا ادراک ہو
یہ نہیں تو صور پھنک جائے کہ قصہ پاک ہو

واقعۂ کربلا اور شہادتِ امام حسینؑ کو انقلاب آزادی اور عزتِ نفس کی علامت کے طور پر استعمال کرنے والے اور اس واقعہ کے حوالے سے سامراجیت کے خلاف احتجاج و انقلاب کا نعرہ بلند کرنے والے، جوش پہلے شاعر ہیں حالانکہ کربلا کے تلازمات اردو شاعری میں جوش سے پہلے بھی کہیں کہیں شعراء کے یہاں مل جاتے ہیں لیکن جوش نے اسے انقلاب اور احتجاج کی علامت بنا دیا۔ سوگواران حسینؑ سے خطاب اس سلسلہ میں ان کا زبردست مسدس ہے۔ اس مختصر مسدس کے شروع کے بند میں انھوں نے کربلا اور امام حسینؑ کی عظیم قربانی کا ذکر خاص انداز میں کیا ہے اور نویں بند سے گریز کرکے انھوں نے ایک طرف سوگواران حسین پیروی امام حسینؑ میں حق و انصاف کے لیے آواز اٹھانے اور آزادی کی جدوجہد میں جان نثار کرنے کی تلقین کی ہے تو دوسری طرف ذاکر کو ہدف بنایا ہے ۔

انقلاب تند خو جس وقت اٹھائے گا نظر
کروٹیں لے گی زمیں ہوگا فلک زیر و زبر

کانپ کر ہونٹوں پہ آجائے گی روح بحروبر
وقت کی پیرانہ سالی سے بھڑک اٹھے کا سر
موت کے سیلاب میں ہر خشک و تر بہہ جائے گا
ہاں مگر نامِ حسینؑ ابنِ علیؑ رہ جائے گا

اور پھر اس طرح گریز کرتے ہیں

تم سے کچھ کہتا ہے اب اے ہوگواران حسینؑ
یاد بھی ہے تم کو تعلیم امام مشرقین
تا کجا بھولے رہو گے غزوہ بدر و حنین
کب تک آخر ذاکروں کے ہجرانہ شور و شین
ذاکروں نے موت کے سانچے میں دل ڈھالے نہیں
یہ شہید کربلا کے چاہنے والے نہیں

کہہ چکا ہوں بارہا اور اب بھی کہتا ہوں یہی
مانعِ شیون نہیں میرا پیام زندگی
لیکن اتنی عرض ہے اے نوا اسیر بزدلی
اپنی نبضوں میں رواں کر خونِ سرجوش علی
ابن کوثر پہلی اپنی تلخ کامی کو تو دیکھ
اپنے ماتھے پر ذرا مہر غلامی کو تو دیکھ

دور محکومی میں راحت کفر، عشرت ہے حرام
مہ وشوں کی چاہ ساقی کی محبت ہے حرام
علم ناجائز ہے دستار فضیلت ہے حرام

انتہا یہ ہے غلاموں کی عبادت ہے حرام
کوئے ذلت میں ٹھہرنا کیا گزرنا بھی حرام
صرف جینا ہی نہیں اس طرح مرنا بھی حرام
(سوگوان حسین سے خطاب)

ذاکر کے لیے مقصد حیات گریہ وزاری ہے اور جوش کے کردار امام حسینؑ، یعنی ظلم اور ناانصافی کے خلاف جہاد۔ وہ امام حسینؑ کی طرح وقت کی آواز پر ایک نیا انقلاب پیدا کرنے کی دعوت دیتے ہیں اور ذاکروں کے رائج کیئے ہوئے تصورِ عزا پر اعتراض کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔

ننگ کا موجب ہے یہ اہل وفا کے واسطے
یوں نہ ماتم کر شہید کربلا کے واسطے
مانعِ شیون نہیں میرا پیام مستقل
گریہ فطری شے ہے دشمن پر بھی بھر آتا ہے دل
دل نہیں پتھر ہے، مولا پر نہ ہو، جو مضمحل
گریۂ مومن سے ہے تزئینِ بزم آب و گل

کون کہتا ہے کہ دل کے حق میں غم اچھا نہیں
پھر بھی گریہ شغلِ نصب العین بن سکتا نہیں

خلق میں محشر بپا ہے اور تو مصروف خواب
خون میں ذلت کی موجیں کھا رہی ہیں پیچ و تاب

دیکھ تو کتنی مکدر ہے فضائے روزگار
کس طرح چھایا ہوا ہے حق پہ باطل کا غبار

بزم یزدانی میں روح اہرمن ہے گرم کار
میان سے باہر ابل پڑ اے علی کی ذوالفقار
نقشِ حق کو اب بھی اے ظالم جلی کرتا نہیں
اب بھی تقلید حسین ابن علی کرتا نہیں

یہاں پر یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ یہ نظمیں آج سے تقریباً ۸۰ سال پہلے لکھی گئی تھیں۔ اُس زمانے کے مذہبی تصورات اور مذہبی حسیّت (SENSIBILITY) اور آج کی مذہبی حسیّت میں بڑا فرق ہے اس وقت کسی عقیدے کے بارے میں ایک لفظ بھی کہنا یا سننا مشکل تھا لیکن جوش اتنے سخت الفاظ میں خطاب کرتے ہیں۔ آج منطقی ادرات REASONING کا عہد ہے اس کے باوجود ذرا سی بات پر فساد ہو جاتا ہے۔ بازار اور گھر جلائے جانے لگتے ہیں لیکن جوش اپنے نقطۂ نظر کو اعلانیہ اور سخت ترین بیان کرنے میں اپنی شخصیت اور مقبولیت کی پرواہ بھی نہیں کرتے۔

جوش نے 1941 میں اپنا دوسرا مرثیہ ''حسین اور انقلاب'' لکھا یہ وہ زمانہ تھا، جب تحریکِ آزادی اپنے شباب پر تھی اس لیے اس مرثیہ میں حسینؑ اور کربلا کو انصاف کے لیے، جنگ اور انقلاب کی علامت بنا کر پیش کیا چونکہ اِسے وہ مرثیے کی شکل میں لکھ رہے تھے اس لیے اس میں ان کا انداز جارحانہ نہیں ہے لیکن اس میں وہ احتجاج موجود ہے جو ان کی دوسری نظموں میں ملتا ہے۔

مجروح پھر ہے عدل و مساوات کا شکار
اس بیسویں صدی میں ہے پھر طرفہ انتشار
پھر نائب یزید ہیں دنیا کے شہر یار
پھر کربلائے نو سے ہے نوعِ بشر دوچار
اے زندگی جلال شہہ مشرقین دے
اس تازہ کربلا کو بھی عزم حسینؑ دے

پھر گرم ہے فساد کا بازار دوستو
سرمایہ پھر ہے برسر آزار دوستو
تاکے یہ خوفِ اندک بسیار دوستو
تلوار ہاں اُٹھی ہوئی تلوار دوستو
جو تیز تر ہو خونِ امارت کو چاٹ کر
رکھ دے جو سیم وزر کے پہاڑوں کو کاٹ کر

بل کھا رہے ہیں دہر میں پھر سیم و زر کے ناگ
گونجے ہوئے ہیں گنبد گرداں میں غم کے راگ
پھر موت رخشِ زیست کی تھامے ہوئے ہے باگ
تا آسماں بلند ہو اے زندگی کی آگ
فتنے کو اپنی آنچ کے چولہے میں جھونک دے
ہاں پھونک دے، قبائے امارت کو پھونک دے

(حسین اور انقلاب)

جوش کے مرثیے 'حسین اور انقلاب' کی ایک تاریخی اہمیت یہ ہے کہ وہ اردو میں جدید مرثیے کا آغاز ہے جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں لیکن اس مرثیے کو اگر توجہ سے دیکھا جائے تو محسوس ہوگا کہ اس میں جوش کا رخ بدلا ہوا ہے، اب تک ان کے احتجاج کا مرکز سوگوارانِ حسینؑ اور ذاکر تھے لیکن اس میں ان کے احتجاج کا ہدف سرمایہ داری ہے۔ یہ اصطلاح پہلی بار جوش ہی نے مرثیے میں استعمال کی ہے، جو ان پر ترقی پسند اثرات کی نشاندہی کرتا ہے یعنی وہ انگریز کی مخالفت کے بجائے اس نظام کی بنیاد پر ضرب لگاتے ہیں۔ انگریز کے جانے یا آزادی کے مل جانے کے بعد بھی کسی نہ کسی شکل میں سرمایہ داری ملک کے سیاسی نظام میں دخیل رہی اس لیے وہ 1956 کے اپنے مشہور مرثیے ''موجد و مفکر'' میں بھی اس کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں ۔

ہونکتا پھرتا ہے پھر سرمایہ داری کا وقار
اٹھ چکا ہے پھر عوامی برتری کا اعتبار

جہل پھر رکھے ہوئے ہے علم کے سر پر قدم
خاک میں پھر مل چکا ہے آدمیت کا بھرم
زندگی پر مارتے پھرتے ہیں ٹھونگیں پر درم
کھل چکا ہے پھر دل انسان میں سونے کا علم

پھر دفِ زر بج رہا ہے شور ہے اشرار کا
صف شکن یہ وقت ہے پھر تیغ کی جھنکار کا

جوش نے ہندوستان کی آزادی کا جو خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر بھی انھوں نے دیکھ لی۔ ملک آزاد ہوا لیکن ان کی سب سے بڑی خواہش اور خواب کی تعبیر جس طرح سامنے آئی وہ اُس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ وہ آزادی اپنے ہی بھائیوں اور اپنی ہی صدیوں پرانی تہذیب کے خون میں لت پت ہوگی۔ ان کے ذہن میں آزادی بہار، محبت اور مسرت کا پیغام تھی لیکن جوش کے سامنے کچھ اور آیا اور ایک بار پھر ترانۂ آزادی میں ان کے احتجاج کی آواز بلند ہوگئی ؂

جنون وجبر وجنگ ہے جہاد وجور وقہر ہے
جدال گاؤں گاؤں ہے قتال شہر شہر ہے
سیاہیوں کی موج ہے تباہیوں کی لہر ہے
ہوا میں جوئے مرگ ہے فضا میں بوئے زہر ہے

کماں میں تیر شحنہ ہے کمیں میں شہریار ہے
خزاں کہیں گے پھر کسے اگر یہی بہار ہے

ترانۂ آزادی وطن: دوسری آواز

جوش کی شاعری میں احتجاج کی دو واضح صورتیں نظر آتی ہیں۔ ایک ان کا تصور انقلاب اور جارحانہ انداز جو ان کی ابتدائی شاعری سے لے کر 42-1940 کی شاعری تک ان پر حاوی نظر آتا ہے جس میں ایک قیامت کا طوفان اور بغاوت کی گھن گرج ہے گوکہ یہ گھن گرج جو آج ساعت پر بار محسوس ہوتی ہے، اس نے اس عہد کے لوگوں کو شدت سے متاثر کیا۔ عام پڑھے لکھے لوگوں کو ان کی بہت سی نظمیں زبانی یاد تھیں ان کے یہاں احتجاج کا دوسرا رخ قدرے ٹھہرا ہوا ہے۔ وہ کوئی سیاسی مفکر یا سماجی مصلح نہیں تھے۔ وہ صرف شاعر تھے اور ایسے شاعر جسے الفاظ اور اظہار پر بلا کی قدرت تھی اور اس سے وہ ایک صوتی گونج پیدا کر دیتے تھے لیکن آزادی کے بعد کی شاعری خصوصاً 'الہام و افکار' کی شاعری میں ایک فکر بھی ہے اور ٹھہراؤ بھی۔ احتجاج ان نظموں میں بھی ہے لیکن موضوع اور انداز بدلا ہوا ہے، یہاں وہ محبت، امن اور انسانیت کا ایک وسیع نقطۂ نظر پیش کرتے اور سیاست و جغرافیہ کی بنائی دیواروں کو گرا دینا چاہتے ہیں۔

کہتا ہوں پھر کہ دل میں کدورت نہ چاہیے
وحدت کے سر پہ ضربت کثرت نہ چاہیے

مطلق اکائی میں عددیت نہ چاہیے
غیریت و شر و عصبیت نہ چاہیے

آفاق ایک جسم ہے اور ایک ذات ہے
اے دوست وہم غیر جہالت کی بات ہے

(وحدت انسانی)

اے دوست دشمنی کا یہ بیوپار تا کجا
یہ نسل و دہن و رنگ پہ تکرار تا کجا
یہ گفتگو میں تیغ کی جھنکار تا کجا
خود اپنے ہی گلے پہ یہ تلوار تا کجا

کب تک نہ باز آئے گا ناداں جنون سے
کب تک رنگے گا ہاتھ، خود اپنے ہی خون سے

تفریق جو سکھائے وہ تاریخ پھاڑ دے
جغرافیہ محبس دیریں اجاڑ دے
نقشوں کی نیش دار لکیریں بگاڑ دے
ایمان اور کفر کو دامن سے جھاڑ دے
للہ افتراق کا دروازہ بند کر
اٹھ اور نوائے وحدت انسان بلند کر

(الہام افکار ص 241-240)

جوش ایک نئے نظام اور نئی دنیا کی تمنا کرتے ہیں جہاں کسی طرح کا کوئی افتراق نہ ہو۔ وہ پہلے بھی اس خواہش کا اظہار کرتے رہے ہیں اور اس دنیا میں انسان کو مذہب رنگ نسل، زبان، اور جغرافیہ کے ذریعہ تقسیم کرنے پر احتجاج کرتے ہیں جوش کے احتجاج کی یہ منفرد آواز آج بھی ان در و دیوار سے ٹکراتی رہتی ہے جو رنگ و نسل یا سیاسی بالادستی کا شکار ہوتے ہیں۔

✓